کے متوفی صاحب کو آموں کی طلب میں لکھا ہے۔ اُسمیں لکھتے ہیں "نخمی شکم بندہ ام، وقدرے ناتوان؛ ہم آرائشِ خوان جویم، وہم آسائشِ جان۔ خِرَدوَراں دانند کہ ایں ہر دو صفت بہ انبہ اندر ست؛ و اہلِ کلکتہ بر آنند کہ قلم و انبہ ہگلی بندرست۔ آرے انبہ از ہگلی، وگل از گلشن؛ انیار از جناب، وسپاس از من۔ شوق می سگالد کہ تا پایانِ موسم دو سہ بار بخاطرِ دلی نعمت خواہم گذشت۔ و آز می نالد کہ حاشا بدیں بار برخورداری خورسند نخواہم گشت"

آم کی طلب

ایک روز مرحوم بہادر شاہ آموں کے موسم میں چند مصاحبوں کے ساتھ۔ جن میں مرزا بھی تھے۔ باغِ حیات بخش یا مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے۔ آم کے پیڑ رنگ برنگ کے آموں سے لد رہے تھے۔ یہاں کا آم بادشاہ یا سلاطین یا بیگمات کے سوا کسی کو میسّر نہیں آسکتا تھا۔ مرزا بار بار آموں کی طرف غور سے دیکھتے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا "مرزا اس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو؟ مرزا نے ہاتھ باندھکر عرض کیا "پیر و مرشد یہ جو کسی بزرگ نے کہا ہے " بر سرِ ہر دانہ بنوشتہ عیاں ٭ کایں فلاں ابنِ فلاں ابنِ فلاں ٭ اسکو دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں۔ بادشاہ مسکرائے اور اُسی روز ایک بہنگی عمدہ عمدہ آموں کی مرزا کو بھجوائی۔

لطیفہ

حکیم رضی الدین خاں جو مرزا کے نہایت دوست تھے اُن کو آم نہیں بھاتے تھے ایک دن وہ مرزا کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے؛ اور مرزا بھی وہیں موجود تھے۔ ایک گدھے والا اپنے گدھے لئے ہوئے گلی سے گذرا۔ آم کے چھلکے پڑے تھے؛ گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیے۔ حکیم صاحب نے کہا دیکھیے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔ مرزا نے کہا بے شک گدھا نہیں کھاتا۔

لطیفہ

مرزا کی نیت آموں سے کسی طرح سیر نہوتی تھی۔ اہلِ شہر تحفۃً بھیجتے تھے، خود بازار سے منگواتے تھے؛

لطیفہ

باہر سے دور دور کا آم بطور سوغات کے آتا تھا؛ مگر حضرت کا جی نہیں بھرتا تھا۔ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم ناقل تھے کہ ایک صحبت میں مولانا فضل حق اور مرزا اور دیگر احباب جمع تھے؛ اور آم کی نسبت ہر شخص اپنی اپنی رائے بیان کر رہا تھا کہ اُس میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ جب سب لوگ اپنی اپنی کہہ چکے تو مولانا فضل حق نے مرزا سے کہا کہ تم بھی اپنی رائے بیان کرو۔ مرزا نے کہا بھئی میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہئیں؛ میٹھا ہو اور بہت ہو۔ سب حاضرین ہنس پڑے۔

شراب نوشی

مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی۔ جو مقدار اُنھوں نے مقرر کر لی تھی اُس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے۔ جس بکس میں بوتلیں رہتی تھیں اُسکی کنجی داروغہ کے پاس رہتی تھی؛ اور اُسکو سخت تاکید تھی کہ اگر رات کو سرخوشی کے عالم میں مجھکو زیادہ پینے کا خیال پیدا ہو تو ہرگز میرا کہنا نہ ماننا؛ اور کنجی مجھکو نہ دینا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو کنجی طلب کرتے تھے؛ اور نشے کی جھانجھ میں داروغہ کو بہت بُرا بھلا کہتے تھے؛ مگر داروغہ نہایت خیر خواہ تھا ہرگز کنجی نہ دیتا تھا۔ اوّل تو وہ مقدار میں بہت کم پیتے تھے؛ دوسرے اُسمیں دو تین حصے گلاب ملا لیتے تھے۔ جس سے اُسکی حدت اور تیزی کم ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایک جگہہ کہتے ہیں۔

آسودہ باد خاطرِ غالب کہ خوے اوست   آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

مگر باوجود اِس قدر احتیاط اور اعتدال کے اِس کا فرنشے کی عادت نے آخرِ کار مرزا کی صحت کو سخت صدمہ پہنچایا جسکی شکایت سے اُنکے تمام اُردو رقعات بھرے ہوئے ہیں۔

مرزا کے خاص خاص شاگرد اور دوست۔ جن سے نہایت بے تکلفی تھی۔ اکثر شام کو اُن کے پاس جا کر بیٹھتے تھے۔ اور مرزا سرور کے عالم میں اُس وقت بہت پُرلطف باتیں کیا کرتے تھے۔

لطیفہ: ایک روز میر مہدی مجروح بیٹھے تھے؛ اور مرزا پلنگ پر پڑے ہوئے کراہ رہے تھے۔ میر مہدی پانو دابنے لگے۔ مرزا نے کہا بھئی تو سید زادہ ہے، مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے؟ اُنھوں نے نہ مانا؛ اور کہا آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اُجرت دیدیجئے گا۔ مرزا نے کہا ہاں اسکا مضائقہ نہیں۔ جب وہ پیر داب چکے اُنھوں نے اُجرت طلب کی۔ مرزا نے کہا "بھیا کیسی اُجرت؟ تم نے میرے پانو دابے؛ میں نے تمھارے پیسے دابے؛ حساب برابر ہوا۔

لطیفہ: ایک دن قبل غروبِ آفتاب کے مرزا صاحب شام کا کھانا کھا رہے تھے اور کھانے میں صرف شامی کباب تھے میں بھی وہاں موجود تھا اور اُنکے سامنے بیٹھا رومال سے مکھیاں جھل رہا تھا۔ مرزا نے کہا "آپ ناحق تکلیف فرماتے ہیں؛ میں ان کبابوں میں سے آپ کو کچھ نہ دونگا۔ پھر آپ ہی یہ حکایت بیان کی کہ "نواب عبدالاحد خاں کے دسترخواں پر اُن کے مصاحبوں اور عزیزوں اور دوستوں کے لئے ہر قسم کے کھانے چُنے جاتے تھے؛ مگر خاص اُنکے لئے ہمیشہ ایک چیز تیار ہوتی تھی۔ وہ اُسکے سوا اور کچھ نہ کھاتے تھے۔ ایک روز اُنکے لئے مزعفر پکا تھا؛ وہی اُنکے سامنے لگایا گیا۔ مصاحبوں میں ایک ڈوم بہت منھ لگا ہوا تھا جو اُسوقت دسترخوان پر موجود تھا۔ نواب نے اُسکو کھانا دینے کے لئے خالی رکابی طلب کی۔ اُسکے آنے میں دیر ہوئی۔ نواب کھانا کھاتے جاتے تھے اور خالی رکابی بار بار مانگتے تھے۔ وہ مصاحب نواب کے آگے رومال ہلانے لگا؛ اور کہا "حضور اور رکابی کیا کیجیے گا اب یہی خالی ہوئی جاتی ہے"۔ نواب یہ فقرہ سُنکر پھڑک گئے اور وہی رکابی اُسکی طرف سرکا دی"۔

لطیفہ: ایک دفعہ رات کو پلنگ پر لیٹے ہوئے آسماں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تاروں کی ظاہری بے نظمی اور انتشار دیکھکر بولے "جو کام خودرائی سے کیا جاتا ہے اکثر بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ ستاروں کو تو دیکھو

کس ابتری سے بکھرے ہوئے ہیں؛ نہ تناسب ہے، نہ انتظام ہے، نہ بیل ہے، نہ بوٹا ہے، مگر بادشاہ خود مختار ہے؛ کوئی دم نہیں مار سکتا۔

لطیفہ: ایک دن سید سردار مرزا مرحوم شام کو چلے آئے۔ جب تھوڑی دیر ٹھیر کر وہ جانے لگے تو مرزا خود اپنے ہاتھ میں شمعداں لے کر جھکتے ہوئے لبِ فرش تک آئے تاکہ روشنی میں جوتا دیکھکر پہن لیں۔ اُنھوں نے کہا قبلہ و کعبہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی؟ میں اپنا جوتا آپ پہن لیتا۔ مرزا نے کہا "میں آپ کا جوتا دکھانے کو شمعدان نہیں لایا؛ بلکہ اس لئے لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں۔

اگرچہ شاعری کی حیثیت سے اُنھوں نے شراب کی جابجا تعریف کی ہے مگر اعتقاداً وہ اُسکو بہت بُرا جانتے تھے؛ اور اپنے اس فعل پر سخت نادم تھے۔ باوجود اسکے اُنھوں نے کبھی اپنے اس فعل کو چھپایا نہیں

لطیفہ: شراب کے متعلق اُنکی ظرافت آمیز باتیں بہت مشہور ہیں۔ ایک شخص نے اُنکے سامنے شراب کی نہایت مذمت کی اور کہا کہ شراب خوار کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ مرزا نے کہا بھائی جسکو شراب میسر ہے اُسکو اور کیا چاہیے جسکے لئے دعا مانگے۔

لطیفہ: ایک خط کو اس طرح شروع کرتے ہیں "دیے مے نکند در کفِ من خامہ روائی ÷ سردست ہوا آتش بے دود کجائی" میر مہدی! صبح کا وقت ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں؛ ہاتھ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی سہی مگر وہ آتشِ سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لئے فوراً رگ و پئے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہوگیا، دماغ روشن ہوگیا، نفسِ ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔ ساقی کوثر کا بندہ اور تشنہ لب!!! ہائے غضب ہائے غضب"۔ یہ خط غدر کے بعد اُس زمانے میں لکھا ہے جب پنشن وغیرہ سب بند ہے اور بسبب عسرت و تنگدستی کے کچھ پیتے پلاتے نہیں ہیں۔

میر مہدی مجروح نے جے پور سے خط بھیجا ہے اور وہاں جو کسی تقریب میں کئی سو من مصری کا شربت مہمانوں کے لئے کیا گیا تھا اسکا ذکر لکھا ہے اُسکے جواب میں مرزا لکھتے ہیں

"میر احمد حسین و مرزا قربان بیگ نامۂ شما را خواندند و بہ ذوقِ شربت ہفت صد من نبات ہر دو را آب در دہن گشت سخن از بادۂ ناب نبود، ورنہ مرا نیز دل از جا رفتے،،

مرزا نے غزلیات و قصائد و قطعات و رباعیات میں شراب کے متعلق جس قدر مضمون باندھے ہیں وہ خواجہ حافظ اور عمر خیام سے کم نہونگے ؛ یہاں ایک شعر اردو غزل کا اور ایک فارسی غزل کا اور ایک فارسی رباعی لکھی جاتی ہے۔

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں ـــ یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں
خجلت نگر کہ در خستام نیافتند ـــ جز روزۂ درست بہ صہبا کشودہ
غالب بسخن گرچہ کست ہمسر نیست ـــ از نشۂ ہوش ہیچت اندر سر نیست
مے خواہی و منت و تغزو آنگہ بسیار!!! ـــ ایں بادہ فروش ساقیِ کوثر نیست

مرزا اسلام کی حقیقت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے اور توحید وجودی کو اسلام کا اصلِ اصول اور رکنِ رکین جانتے تھے۔ اگرچہ وہ بظاہر اہلِ حال سے نہ تھے ؛ مگر جیسا کہ کہا گیا ہے "من احب شیئاً اکثر ذکرہ"، توحیدِ وجودی اُنکی شاعری کا عنصر بن گئی تھی۔ اس مضمون کو اُنھوں نے جس قدر اصنافِ سخن میں بیان کیا ہے غالباً نظیری اور بیدل کے بعد کسی نے نہیں بیان کیا۔ مرزا کے حق میں اگر اور کچھ نہیں تو عرفی کا یہ شعر ضرور صادق آتا ہے۔

امید ہست کہ بیگانگیِ عرفی را ـــ بہ دوستی سخن ہاے آشنا بخشند

اُنھوں نے تمام عبادات اور فرائض و واجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں ایک توحید وجودی اور دوسرے نبی اور اہلبیتِ نبی کی محبت ؛ اور اسی کو وہ وسیلۂ نجات سمجھتے تھے۔

اگرچہ شاعر کے کلام سے اُسکے عقائد پر استدلال نہیں ہو سکتا مگر جو بات دل سے نکلتی ہے وہ چھپی نہیں رہتی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر حکماے اسلام نے نعیم جسمانی سے انکار کیا ہے مرزا بھی اُسکے قائل نہ تھے چنانچہ اُنھوں نے اس خیال کو اپنے شاعرانہ انداز میں متعدد جگہ ظاہر کیا ہے ایک جگہ کہتے ہیں "ہمکو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن ؛ دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے"

یہی خیال ایک فارسی رباعی میں اس طرح ظاہر کیا ہے "گردیدنِ زاہداں بجنت گستاخ ؛ واں دست درازی بہ ثمر شاخ بشاخ ؛ چوں نیک نظر کنی ز روے تشبیہ ؛ مانند بہائم و علف زار فراخ"

مرزا باوجودیکہ احکامِ ظاہری کے بہت کم پابند تھے ؛ لیکن مسلمانوں کی ذلت کی کوئی بات سن پاتے تھے تو اُن کو سخت رنج ہوتا تھا ایک روز میرے سامنے اسی قسم کے ایک واقعہ پر نہایت افسوس کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھ میں کوئی بات مسلمانی کی نہیں ہے ؛ پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھکو کیوں اس قدر رنج اور تاسف ہوتا ہے ؛ مگر چونکہ طبیعت نہایت شوخ واقع ہوئی تھی۔ جب کوئی گرم فقرہ سوجھ جاتا تھا پھر اُن سے بغیر کہے نہیں رہا جاتا تھا ؛ خواہ اس میں اُنکو کوئی کافر سمجھے ؛ یا رند مشرب کہے ، یا بدمذہب جانے۔

غدر کے بعد۔ جبکہ پنشن بند تھی اور دربار میں شریک ہونے کی اجازت نہوئی تھی۔ پنڈت موتی لال میر منشی لفٹنٹی پنجاب مرزا صاحب سے ملنے کو آئے۔ کچھ پنشن کا ذکر چلا۔ مرزا صاحب نے کہا "تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر ؛ اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار ؛ پھر میں

نہیں جانتا کہ سرکار نے کس طرح مجھے باغی مسلمانوں میں شمار کیا۔

اگرچہ مرزا کا اصل مذہب صلح کل تھا مگر زیادہ تر انکا میلانِ طبع تشیع کی طرف پایا جاتا تھا اور جناب امیرؑ کو وہ رسول خدا کے بعد تمام اُمت سے افضل جانتے تھے۔

ایک بار مرحوم بہادر شاہ نے دربار میں یہ کہا کہ ہمنے سُنا ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب شیعی المذہب ہیں۔ مرزا کو بھی اطلاع ہوگئی۔ چند رباعیاں لکھکر حضور کو سُنائیں۔ جن میں تشیع اور رفض سے تحاشی کی تھی۔ اُن میں سے ایک رباعی جو بہت لطیف ہے مجھکو یاد رہ گئی ہے جو یہاں لکھی جاتی ہے

رباعی

جن لوگوں کو ہے مجھسے عداوت گہری ۔۔۔ کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیونکر ہو جو کہ ہووے صوفی ؟ ۔۔۔ شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری ؟

دہریت اور تصوف میں جو بُعدِ بعید ہے وہ ظاہر ہے؛ دہری خدا کے وجود ہی کا قائل نہیں اور صوفی صرف خدا ہی کو موجود جانتا ہے اور ماسوا کو ہیچ سمجھتا ہے پس صوفی دہری کیونکر ہو سکتا ہے؟ چوتھے مصرع کا یہ مطلب ہے کہ ماوراء النہر یعنی ترکستان کے لوگ متعصب سُنّی ہونے میں ضرب المثل ہیں؛ یہاں تک کہ شیعہ اُن کو ناصبی اور خارجی سمجھتے ہیں۔ چونکہ مرزا کی اصل ماوراء النہر سے تھی اِسلیے کہتے ہیں کہ ایک ماوراء النہری رافضی یا شیعی کیونکر ہو سکتا ہے؟

جو لوگ مرزا کی طرزِ مزاج اور طرزِ کلام سے ناآشنا ہیں وہ شاید یہ سمجھیں کہ مرزا نے بادشاہ کی حضور میں اپنا رسوخ قائم رکھنے کے لئے اپنا مذہب غلط بیان کیا؛ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ

رباعیاں صرف بادشاہ کے خوش کرنے اور اہلِ دربار کے ہنسانے کے لئے لکھی گئی تھیں؛ کیونکہ دربار میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جو مرزا کو شیعی یا کم سے کم تفضیلی نہ جانتا ہو۔ مرزا اکثر مواقع پر بادشاہ کے خوش کرنے کو اِس قسم کے اشعار دربار میں پڑھا کرتے تھے ایک روز سلطان نظام الدین قدس سرہٗ اور امیر خسرو کی خصوصیت کا ذکر دربار میں ہو رہا تھا مرزا نے اُسی وقت یہ شعر انشا کرکے پڑھا

"ملے دو مرشدوں کو قدرتِ حق سے ہیں دو طالب ۔۔۔ نظام الدین کو خسرو سراج الدین کو غالب"

رمضان کا مہینا تھا؛ ایک سُنّی مولوی مرزا سے ملنے کو آئے۔ عصر کا وقت تھا۔ مرزا نے خدمتگار سے پانی مانگا۔ مولویصاحب نے تعجب سے کہا "کیا جناب کو روزہ نہیں ہے؟" مرزا نے کہا "سُنّی مسلمان ہوں؛ چار گھڑی دن رہے روزہ کھول لیتا ہوں"

ایک دفعہ بہادر شاہ بہت سخت بیمار ہوئے۔ اُس زمانے میں مرزا حیدر شکوہ جو اکبر شاہ کے بھتیجے اور مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے تھے وہ بھی لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے اور بادشاہ کے ہاں مہمان تھے۔ انکا مذہب اثنا عشری تھا۔ جب بادشاہ کو کسی طرح آرام نہ ہوا مرزا حیدر شکوہ کی صلاح سے خاکِ شفا دی گئی اور اُسکے بعد بادشاہ کو صحت ہوگئی۔ مرزا حیدر شکوہ نے نذر مانی تھی کہ بادشاہ کو صحت ہو جائیگی تو حضرت عباس کی درگاہ میں جو کہ لکھنؤ میں ہے علم چڑھاؤنگا۔ چنانچہ اُنھوں نے لکھنؤ جاکر بادشاہ کو عرضداشت بھیجی کہ میرا مقدور نذر ادا کرنے کا نہیں ہے؛ حضور مدد فرمائیں۔ یہاں سے بادشاہ نے کچھ روپیہ مرزا حیدر شکوہ کو بھجوایا اور اُنھوں نے بڑی دھوم دھام سے علم چڑھایا۔ جس میں اودھ کا تمام شاہی خاندان اور امرا و علما سب شریک تھے۔ اور مجتہد العصر کے ہاتھ سے علم چڑھوایا گیا۔

اِس واقعے کے بعد یہ بات عموماً مشہور ہوگئی کہ بادشاہ شیعہ ہوگئے۔ اِس شہرت کا بادشاہ کو بہت سخت رنج ہوا؛ اور حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے اِسکے تدارک کے لئے کچھ رسالے شائع کرائے، اور بہت سے اشتہارات کوچوں اور بازاروں میں چسپاں کرائے گئے، اور بادشاہ کے حکم سے مرزا صاحب نے بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی۔ جسکا نام غالباً دمغ الباطل رکھا گیا تھا، اور جسمیں بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا۔ اِس مثنوی میں مرزا نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی تھی بلکہ جو مضامین حکیم احسن اللہ خاں نے بتائے تھے اُن کو فارسی میں نظم کردیا تھا۔

جب یہ مثنوی لکھنؤ پہونچی تو مجتہد العصر نے مرزا سے دریافت کیا کہ کیا آپ نے خود مذہب شیعہ اور مرزا حیدر شکوہ کی نسبت اِس مثنوی میں ایسا اور ایسا لکھا ہے؟ مرزا نے لکھ بھیجا کہ میں ملازمِ شاہی ہوں، جو کچھ بادشاہ کا حکم ہوتا ہے اُسکی تعمیل کرتا ہوں۔ اِس مثنوی کا مضمون بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خاں کی طرف سے اور الفاظ میری طرف سے تصوّر فرمائے جائیں۔

مرزا کی طبیعت نہایت سلیم واقع ہوئی تھی۔ باوجودیکہ تیزیٔ ذہن اور سلامتیٔ طبع دونو ایک جگہ بہت کم جمع ہوتی ہیں؛ مرزا میں یہ دونو باتیں بوجہِ اتم موجود تھیں۔ اسی سلامتیٔ طبع کا اقتضا تھا کہ ابتدائے مشقِ سخن میں جو ٹیڑھا رستہ اُنھوں نے اختیار کیا تھا۔ بغیر اِسکے کہ کوئی اُستاد رہبری کرے۔ جس قدر عقل و تمیز بڑھتی گئی اُسی قدر آہستہ آہستہ اُس سے انحراف ہوتا گیا؛ اور آخرکار اساتذۂ مسلّم الثبوت کی روشِ مستقیم پر آرہے۔

مرزا ازراہِ عجز و انکسار کہا کرتے تھے کہ قصائد کی تشبیب میں تو میں بھی جہاں عرفی و انوری پہنچتے ہیں اُنہاں وخیزاں پہنچ جاتا ہوں؛ مگر مدح و ستائش میں مجھسے اُن کا ساتھ نہیں دیا جاتا۔ مرزا کا یہ کہنا

بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے؛ کیونکہ جو زور اُنکی تشبیبوں میں پایا جاتا ہے وہ مدح میں آکر باقی نہیں رہتا۔ مگر ہم اِسکو اُن کے نقصِ شاعری پر محمول نہیں کرتے؛ بلکہ غایت درجے کی سلامتِ ذہن اور استقامتِ طبیع کی دلیل جانتے ہیں۔ جھوٹی اور بے اصل باتوں کو چمکانا، اور زمین و آسمان کے قلابے ملانا، اور مبالغہ و اغراق کا طوفان اُٹھانا فی الحقیقہ شاعر کا کمال نہیں ہے؛ بلکہ جس قدر اُسکی طبیعت ان باتوں سے ابا کرتی ہے اُسی قدر جاننا چاہیے کہ وہ شاعری سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مرزا کی ساری عمر قصیدہ گوئی اور مدح سرائی میں گذری؛ کیونکہ ضرورت انسان سے سب کچھ کراتی ہے، مگر فی الحقیقہ جیسا کہ ہم آگے بیان کرینگے۔ اُن کو کھٹّی کرنے کا طریقہ جیسا کہ چاہیے ویسا نہیں آتا تھا۔

اِس مقام پر ہم ایک واقعہ لکھتے ہیں۔ جس سے مرزا کی سلامتیٔ طبع کا کسی قدر اندازہ ہوسکتا ہے۔ مولانا فضل حق مرحوم مرزا کے بڑے گاڑھے دوست تھے اور اُن کو فارسی زبان کا نہایت مقتدر شاعر مانتے تھے۔ چونکہ مولانا کو وہابیوں سے سخت مخالفت تھی؛ اُنھوں نے مرزا پر نہایت اصرار کے ساتھ یہ فرمائش کی کہ فارسی میں وہابیوں کے خلاف ایک مثنوی لکھدو۔ جس میں اُنکے بڑے بڑے اور مشہور عقیدوں کی تردید اور خاصکر امتناع نظیر خاتم النبیین کے مسئلے کو زیادہ شرح اور بسط کے ساتھ بیان کرو۔ اِس مسئلے میں مولانا اسمعیل شہیدؒ کی یہ رائے تھی کہ خاتم النبیین کا مثل ممکن بالذات اور ممتنع بالغیر ہے؛ ممتنع بالذات نہیں ہے۔ یعنی آنحضرت کا مثل اِس لئے پیدا نہیں ہوسکتا کہ اُسکا پیدا ہونا آپ کی خاتمیت کے منافی ہے؛ نہ اِس لیے کہ خدا اُسکے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ برخلاف اسکے مولانا فضل حق کی یہ رائے تھی کہ خاتم النبیین کا مثل ممتنع بالذات ہے؛ اور جس طرح خدا اپنا مثل پیدا نہیں کرسکتا اسی طرح خاتم النبیین کا مثل بھی پیدا نہیں کرسکتا۔

مرزا صاحب پر یہ فرمائش ہوئی کہ اِس مسٔلے پر جو راے مولانا فضل حق کی ہے وہ فارسی نظم میں بیان کیجائے ۔ مرزا نے اوّل عذر کیا کہ مسائلِ علمی کا نظم میں بیان کرنا مشکل ہے ۔ مگر اُنھوں نے نہ مانا ۔ لاچار مرزا نے ایک مثنوی ۔ جو کہ اُنکے کلیات میں مثنویات کے سلسلے میں چھٹی مثنوی ہے ۔ لکھکر مولانا کو سُنائی ۔ اُنھوں نے بے انتہا تعریف کی اور یہ کہا کہ اگر میں فارسی شعر میں تمھاری برابر مشتاق ہوتا تو بھی ایسی خوبی سے اِن مطالب کو نہ ادا کرسکتا ۔ مگر جو کچھ مرزا نے مسٔلۂ نظیرِ خاتم النبیین کے باب میں کسی قدر مولانا کی راے کے خلاف لکھا تھا اُسپر مولانا سخت ناراض ہوے ۔ مرزا نے صاف صاف تو یہ نہیں لکھا تھا کہ خدا خاتم النبیین کا مثل پیدا کرنے پر قادر ہے ؛ مگر اِس مضمون کو اِس پیرائے میں ظاہر کیا تھا کہ اِس موجودہ عالم میں تو ایک خاتم کے سوا دوسرا خاتم پیدا نہیں ہوسکتا ؛ لیکن خدا قادر ہے کہ ایسا ہی ایک اور عالم پیدا کردے اور اُسمیں خاتم النبیین کا مثل جو اِس دوسرے عالم کا خاتم النبیین ہو خلق فرمادے ۔ چنانچہ اُنھوں نے اِس مضمون کو اِس طرح نظم کیا ہے ۔

یک جہاں تا ہست یک خاتم بس است — قدرتِ حق را نہ یک عالم بس است
خواہد از ہر ذرہ آرد عالمے — ہم بود ہر عالمے را خاتمے
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود — رحمۃٌ للعالمینے ہم بود
کثرتِ ابداعِ عالم خوب تر ؟ — یا بیک عالم دو خاتم خوب تر ؟
در یکے عالم دو تا خاتم مجوے — صد ہزاراں عالم و خاتم بگوے

جب مرزا اوّل بار مثنوی لکھکر مولانا کے پاس لائے تو مضمون مذکور کو اِس اخیر شعر پر ختم کرکے لائے تھے ۔ مولانا نے فرمایا یہ تم نے کیا بکا ہے کہ متعدد عالموں میں متعدد خاتم ہوسکتے ہیں ؟ نہیں بلکہ

اگر لاکھ عالم خدا پیدا کرے تو بھی خاتم النبیین ایک ہی ہوگا ۔ پس اِس مضمون کو مثنوی میں سے بالکل نکال ڈالو اور جس طرح میں کہتا ہوں اُس طرح بیان کرو ۔ مرزا کو نہ وہابیوں سے کچھ خصومت تھی اور نہ اُنکے مخالفوں سے کچھ تعلق تھا ؛ بلکہ صرف دوست کی رضاجوئی مقصود تھی ۔ اُنھوں نے مولانا کے حکم کی فوراً تعمیل کی ۔ جو کچھ پہلے لکھ چکے تھے اُسکو تو اُسی طرح رہنے دیا مگر اُسکے آگے چند اشعار اور اضافہ کرکے کلام کو اِسطرح مربوط کردیا ۔

غالب ایں اندیشہ نپذیرم ہمے — خردہ ۔ ہم بر خویش می گیرم ہمے
اے کہ ختم المرسلینش خواندہٗ — دانم از روے یقینش خواندہٗ
ایں الف لامے کہ استغراق راست — حکمِ ناطق معنیِ اطلاق راست
منشأِ ایجادِ ہر عالم یکیست — گر دو صد عالم بود خاتم یکیست

اِسکے بعد اِسی مضمون کو اور زیادہ پھیلایا ہے ؛ اور پھر مثنوی کو اِن دو شعروں پر ۔ جن میں نظیرِ خاتم النبیین کے ممتنع بالذات ہونے کی تصریح ہے ختم کردیا ہے ۔

منفرد اندر کمالِ ذاتی است — لاجرم مثلش محالِ ذاتی است
زیں عقیدت برنگردم والسلام — نامہ را در مے نوردم والسلام

اوپر کے بیان سے ناظرین کو معلوم ہوا ہوگا کہ مرزا کی طبیعت میں کس قدر سلامت روی تھی ؟ اور اعوجاج سے کس قدر اُنکا ذہن اِبا کرتا تھا ؟ باوجودیکہ مولانا فضل حق نے اِس مسٔلے کے متعلق جو کچھ اُنکی راے تھی مرزا کے خوب ذہن نشین کردی تھی اور مرزا اُسی کو اپنی مثنوی میں بیان کرنا چاہتے تھے مگر جس طرح ایک ٹیڑھی چیز نلکی میں آکر سیدھی ہوجاتی ہے اِسی طرح مرزا کی راست بیانی نے اُس ٹیڑھی راے کے تمام بَل نکال ڈالے اور بغیر اِسکے کہ مرزا کو وہابیوں کی حمایت منظور ہو جو ٹھیک بات تھی وہ

اُنکے قلم سے بے اختیار ٹپک پڑی۔ پھر اُسکے بعد جو کچھ لکھا ہے وہ مولانا کے جبر سے لکھا ہے؛ اُسکو مرزا کے اصلی خیالات سے کچھ تعلق نہیں۔

ہماری سوسائٹی میں جو ایک عام دستور ہے کہ جو شخص اپنا کلام سُناتا ہے اُسکے ہر ایک شعر پر۔ خواہ اچھا ہو خواہ بُرا۔ برابر تحسین و آفریں کی جاتی ہے اور اچھے اور بُرے شعر میں کچھ تمیز نہیں کی جاتی؛ مرزا کی عادت بالکل اسکے برخلاف تھی۔ کوئی کیسا ہی معزز و محترم آدمی ہو جب تک اُسکا کوئی شعر فی الواقع مرزا کو پسند نہ آتا تھا وہ ہرگز اُسکی تعریف نہ کرتے تھے۔ اخیر عمر میں تو اُن کا ثقلِ سماعت انتہا کو پہونچگیا تھا؛ مگر پہلے ایسا حال نہ تھا۔ وہ کسی قدر اونچی آواز سے بات چیت اور شعر و سخن سُن لیتے تھے؛ مگر جب تک کوئی شعر اُن کے دل میں نہ چُبھتا تھا ٹس سے مس نہوتے تھے۔ اُنکے بعض معاصرین اس بات سے آزردہ رہتے تھے؛ اور اسی لئے اُنکی شاعری پر نکتہ چینیاں کرتے تھے۔ مگر۔ مرزا باوجودیکہ اُن کی طبیعت نہایت صلح جُو واقع ہوئی تھی۔ شعر کی داد دینے کا جو طریقہ اُنھوں نے اختیار کیا تھا اُسکو وہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ لیکن جو شعر اُن کے دل میں چُبھ جاتا تھا اُسکی تعریف بھی ایسی کرتے تھے جو مبالغے کی حد کو پہنچ جاتی تھی۔ وہ درحقیقت کسی کے خوش کرنے کے لئے ایسا نہیں کرتے تھے؛ بلکہ ذوقِ سخن اُن کو بے اختیار کر دیتا تھا۔ شیخ ابراہیم ذوق کی نسبت مشہور ہے کہ مرزا کو اُن سے چشمک تھی۔ ایک روز جب کہ مرزا شطرنج میں مصروف تھے منشی غلام علیخاں مرحوم نے اُنکا یہ شعر کسی دوسرے شخص کے سنانے کو پڑھا۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے   مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

خانِ مرحوم کہتے تھے کہ مرزا کے کان میں بھی اسکی بھنک پڑگئی فوراً شطرنج چھوڑدی اور مجھسے کہا بھیا تمنے کیا پڑھا؟ میں نے پھر وہ شعر پڑھا۔ پوچھا کس کا شعر ہے؟ میں نے کہا ذوق کا۔ یہ سُنکر نہایت متعجب

ہوے؛ اور مجھسے بار بار پڑھواتے تھے اور سر دُھنتے تھے۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ مرزا نے اپنے اُردو خطوں میں اس شعر کا جابجا ذکر کیا ہے۔ جہاں عمدہ شعر کی مثالیں دی ہیں وہاں اس شعر کو ضرور لکھا ہے۔ اسی طرح مومن خاں کا جب یہ شعر سُنا۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا   جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو اسکی بہت تعریف کی اور یہ کہا "کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھکو دے دیتا"۔ اس شعر کو بھی اُنھوں نے اپنے متعدد خطوں میں نقل کیا ہے۔ اسی طرح سودا کا یہ شعر بھی ایک مقام پر لکھا ہے

دکھلائیے لیجا کے تجھے مصر کا بازار   لیکن کوئی خواہاں نہیں واں جنسِ گراں کا

ایک صحبت میں نواب مرزا خاں داغ کے اس شعر کو بار بار پڑھتے تھے اور اُسپر وجد کرتے تھے۔

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھکر وہ یہ کہتے ہیں   اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

بعض اوقات وہ اپنے شاگردوں کے کلام سے اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ اُنکی تعریف میں شاید اُنکا دل بڑھانے کو حد سے زیادہ مبالغہ کرتے تھے۔ اُنھوں نے اخیر عمر میں اپنے ایک شاگرد کی غزل دیکھکر اُسکی بے انتہا تعریف کی؛ اور یہ کہا "کہ اگر میں اب رشک کرنیکے قابل ہوتا تو تم محسود ہوتے اور میں حاسد"۔ مرزا پر تقریظوں کی بے انتہا فرمائشیں ہوتی تھیں۔ اور۔ جیسا کہ ظاہر ہے تعریف کی مستحق فی الحقیقۃ بہت ہی کم کتابیں ہوتی ہیں۔ مرزا کی طبیعت چونکہ صلح جو اور مرنج و مرنجاں واقع ہوئی تھی وہ کسی سے انکار تو نہیں کرتے تھے؛ مگر تقریظ نگاری کا اُنھوں نے ایسا طریقہ اختیار کیا تھا کہ کوئی بات راستی کے خلاف بھی نہو اور صاحب کتاب خوش بھی ہوجاے۔ بہت سا حصہ تمہید میں، یا مصنف کی ذات اور اُسکے اخلاق، یا اُسکی محبت اور دوستی کے بیان میں، یا اور لطیف اور پاکیزہ باتوں کے ذکر میں مجمل